Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کی ایک ایک بات کا علم تھا۔" وہ بولی ، "میرے دونوں بچے عجیب دماغ کے تھے۔"

اس وقت موقع مناسب جان کر میں نے رسمی افسوس کے چند الفاظ کہے۔ وہ اسی طرح گم سم بیٹھی رہی جیسے اس نے میری بات نہ سنی ہو۔ اچانک مجھے محسوس ہونے لگا جیسے میں نے کوئی غلط بات کہہ دی ہے۔ اس کمرے میں رنج یا افسوس کی رمق تک نہ تھی۔ اس خاتون کا چہرہ قطعی بے تاثر تھا۔ اس پہ نہ غم تھا نہ خوشی ، صرف بڑھاپا تھا۔ وہ دیر تک ایک بت کی مانند بے جنبش بیٹھی اپنے ہاتھوں کو تکتی رہی۔ بچہ بستر سے لٹک کر اترا اور بھاگ کر کمرے سے نکل گیا۔ چائے کی ایک اور سینی آگئی۔ سینی میں صرف دو پیالیاں تھیں۔ نوجوان عورت نے ، جو چائے لے کر آئی تھی ، ایک ایک پیالی مجھے اور حکیم کو بنا کر دی۔ چائے کا گھونٹ میرے حلق میں پھنس کر رہ گیا۔ دفعتاً کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ میں نے گھبرا کر باہر دیکھا۔ کمرے کی فضا نے مجھے اس قدر بے حواس کر رکھا تھا کہ ایک چھوٹے سے بادل کے ٹکڑے نے مجھے خوف زدہ کر دیا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اس سارے قصے کو چھوڑ چھاڑ کر یہاں سے نکل جاؤں۔ میں نے چائے کی پیالی آہستہ سے میز پر رکھ دی۔

پھر بستر میں بیٹھی ہوئی بوڑھی عورت کے ہاتھوں میں خفیف سی حرکت ہوئی۔ اس نے نظر اٹھا کر میری جانب دیکھا۔ "شاہ جی بتاتے ہیں کہ آپ میری بیٹی کو اچھا جانتے تھے۔" وہ بولی۔

"جی ہاں۔" میں نے کہا۔

"آپ کو علم ہے کیا واقعہ ہوا تھا؟" اس نے پوچھا۔

میں نے گلا صاف کیا۔ "صرف اخباری رپورٹ کی حد تک ۔۔۔" میں بولا۔

"تو اب میری بیٹی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

میں خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ میرے ذہن میں کچھ نہ آ رہا تھا۔

"آپ میری بیٹی کو بہت اچھا جانتے تھے۔" اس نے دہرا کر پوچھا ، "اب آپ میری بیٹی کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"مجھے سخت افسوس ہوا تھا۔ یہ سن کر۔" میں رُک رُک کر بولا۔

"آپ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ میں کیا پوچھ رہی ہوں۔ آپ بتانا نہیں چاہتے تو میں آپ کو بتاتی ہوں۔ میری بیٹی اب سب لوگوں کی نظروں میں ایک بدکار عورت ہے۔"

"یہ میری رائے نہیں۔" میں ہمت کر کے بولا۔ "جب تک مجھے سب باتوں کا علم نہ ہو میں کوئی رائے قائم نہیں کرتا۔"

"اگر آپ واقعی سچ بول رہے ہیں تو پھر معصومیت کی بات کرتے ہیں۔" وہ بولی، "آپ کو اپنا علم تک نہیں۔"

"کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ کی جو رائے بننی تھی بن چکی ہے۔ بقیہ باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"میں آپ کی بات کی تردید کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔" میں نڈر ہو کر بولا، "مگر میری یہ رائے ہرگز نہیں۔"

کوثر کی ماں نے دو بار آنکھیں جھپکیں، مگر میرے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔

"ہو سکتا ہے۔" وہ آہستہ سے بولی، "آپ ٹھیک کہتے ہوں۔ مگر آپ ایک آدمی ہیں، پوری خدائی تو نہیں۔" اپنی آنکھیں میرے چہرے سے ہٹائے بغیر وہ دوبارہ گم سم ہو گئی، جیسے تھوڑی دیر کے لیے روح اس کا جسم چھوڑ گئی ہو۔

"سچائی چھپی نہیں رہتی۔" میں نے کہا، "ایک نہ ایک دن نکل ہی آتی ہے۔"

"ساری خدائی کے اندر صرف میں ہوں۔" وہ بولی، "جسے سچائی کا علم ہے۔"

"پھر آپ اسے لوگوں کے سامنے بیان کیوں نہیں کرتیں۔" میں نے کہا۔

"کیا میں اپنی بیٹی کی ناموس کو بچا لوں گی؟" اس نے میری آنکھوں میں دیکھ کر سوال کیا، "جب ایک مرد اپنی بیوی پہ بدکاری کا الزام لگا کر اسے ہلاک کر دیتا ہے تو وہ عورت ساری خدائی کی نظروں میں بدکار ہو جاتی ہے۔ آپ نے کتنے ایسے واقعات دیکھے ہیں۔ کیا آپ کو اس بات کا علم نہیں؟ جب مرد عورت کو ہلاک کرتا ہے تو بھی عورت بدکار ہوتی ہے، جب عورت مرد کو ہلاک کر دیتی ہے تو پھر بھی وہ بدکار ہوتی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عدالتیں صرف جرم کا فیصلہ کرتی ہیں۔ عورت کی بدکاری مسلّم ہوتی ہے۔" اسکی آواز لڑکھڑائی اور خاموش ہو گئی۔ میں چپ بیٹھا اسے تکتا رہا۔ جب وہ دوبارہ بولی تو اس کی آواز مجھے ایسی لگی۔ جیسے وہ مجھ سے مخاطب نہ ہو بلکہ اپنے آپ سے شکایت کر رہی ہو۔ "مردوں کی نظروں میں تو وہ بدکار ہوتی ہی ہے، ان عورتوں کی نظروں میں بھی بدکار ہو جاتی ہے۔ کتنا بڑا ظلم ہے۔ اس کا کوئی ساتھ نہیں دیتا۔"

میرے سامنے وہ عورت، جو ہڈیوں کے ڈھانچے کی شکل میں بستر پر پڑی تھی، اپنے دھیمے لہجے اور کھڑی آواز میں ایسی باتیں کر رہی تھی جو پہلے کبھی میں نے آنکھیں کھول کر نہ دیکھی تھیں۔ میری عقل، میرا ذہن، اور میرا دل اس کی باتوں کے اندر لپٹا جا رہا تھا۔ اس واقعے کی سچائی کیا تھی؟ اصل میں ہوا کیا تھا؟ وہ اب پھر خاموش بیٹھی گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو تکے جا رہی تھی۔

"قدرت کے طریقے بدلے نہیں جا سکتے۔" میں نے کہا، "مگر دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے قانون بنے ہیں۔ ہر جرم کی سزا مقرر ہے۔ اگر آپ اس واقعے کی سچائی بیان نہ کریں گی تو انصاف کیسے ہوگا۔"

"سچائی کا انصاف سے کوئی تعلق نہیں۔" وہ بولی، "عدالت کے سامنے میں کیا کہوں۔ ظفر کے خلاف بیان دوں؟ ظفر کا قصور کیا ہے؟"

میں ہکا بکا منہ کھولے اس کے اور حکیم کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ "معاف کیجیے،" میں نے کہا، "آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"ظفر بے قصور ہے۔" وہ آہستہ سے بولی۔

حکیم اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس قصّے کو طول دینا نہیں چاہتا۔ اس نے کرسی کی پشت سے لٹکی ہوئی چھڑی ہاتھ میں لی اور اجازت چاہنے لگا۔

"میرے خیال میں اب آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔" وہ بولا، "پہلے ہی ہم آپ کو بہت زحمت دے چکے ہیں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں بھی کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کوثر کی ماں منہ پھیر کر گلدان میں رکھے ہوئے پھولوں کے گچھے کو دیکھ رہی تھی۔ اچانک اس نے پہلے میری طرف، پھر حکیم کی طرف دیکھا اور ہاتھ اٹھا کر اسے رکنے کا اشارہ کیا۔

"تشریف رکھیے۔" وہ بولی، "میں اس بچے سے بات کرنا چاہتی ہوں۔" وہ مجھ سے مخاطب ہوئی "بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں بتاتی ہوں کہ اس واقعے کی سچائی کیا ہے۔ میرے خاندان میں سے اب صرف میرا ایک بھائی رہ گیا ہے، اور وہ بھی میری بات نہیں مانتا۔ اگر آج میرا بیٹا یہاں ہوتا تو ضرور میری بات سنتا۔ تم ایک ادیب ہو، ہو سکتا ہے اس بات کو سمجھ جاؤ۔ تمہیں دیکھ کر مجھے اپنا بیٹا یاد آتا ہے۔"

اس کی نظر اور اس کی آواز میں ایک ایسا انداز تھا کہ میں اور حکیم دونوں اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ وہ اب دونوں ہاتھوں کی ایک مٹھی بنا کر بار بار اسے کھول رہی تھی اور سختی سے بند کر رہی تھی۔ آخر اس نے بات شروع کی:

"کوئی آٹھ ماہ ہوئے، ایک دن میری بیٹی میرے پاس آئی اور بولی، ماں میرا دل نہیں لگتا۔ بس اتنا اس نے کہا۔" اس نے آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ "میں نے اس کی بات پر دھیان نہیں دیا۔ میں نے سوچا، عورتوں کا دل کہاں لگا کرتا ہے۔ تم ایک مرد ہو، اس بات کو شاید سمجھ نہ پاؤ۔ مگر یہ حقیقت ہے۔ عورتیں جس دن سے بیاہ کر جاتی ہیں، اس دن کی کسک ان کے دل میں چھپی رہتی ہے۔ ہم میں سے بیشتر یہ جان بھی نہیں پاتیں کہ یہ کس شئے کا درد ہے، کون سی ایسی چیز ہے جو کھو گئی ہے۔ گزارہ چلتا رہتا ہے۔ میں نے سمجھا ایسی ہی کوئی بات ہے، وقت نکل جائے گا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ نوبت یہاں تک آئے گی۔ وہ جس کو اپنے بطن سے میں نے جنم دیا تھا، اس کے دل کی مجھے پہچان نہیں تھی۔ مہینے دو مہینے میں وہ میرے پاس آتی رہتی تھی۔ اس دن کے بعد ہفتے دو ہفتے میں چکر لگانے لگی۔ بچے میرے پاس چھوڑ کر باہر کھیتوں میں نکل جاتی۔ دن دن بھر گھومتی رہتی۔ ایک روز شام کو وہ باہر سے لوٹی تو میں اس پر نظر ڈال کر حیران رہ گئی۔ چند مہینے میں اس لڑکی کا حلیہ بدل گیا تھا۔ دھوپ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے چہرے سے اتر گئی تھی، سائے نکل آئے تھے۔ میں نے پاس بٹھا کر پوچھا، کیا بات ہے بیٹی، تم ٹھیک تو ہو۔ کہنے لگی ماں، آج کئی مہینوں میں پہلی بار آپ نے میری طرف دیکھا ہے، آپ بتائیں کہ کیا بات ہے۔ میرا دل دہل گیا۔ وہ سچی بات کر رہی تھی۔ میں اس کے بچوں میں اتنی مصروف ہو گئی تھی کہ میں نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ میں نے کہا بیٹی، مجھ سے کیا پوچھتی ہو، میں بوڑھی ہو گئی ہوں۔ چلو بتاؤ، تم نے کیا حال بنا رکھا ہے۔ کہنے لگی اماں، میں آپ کو بتا چکی ہوں۔ میرا دل نہیں لگتا۔ میں نے کہا بھلا دل نہ لگنے سے یہ حال ہوتا ہے۔ یہ کیا بات ہوئی۔ تم کھاتی پیتی تو درست ہو؟ اس وقت میری بیٹی پہلی بار میرے ساتھ غصے میں آئی اور بولی، ماں آپ میری بات کیوں نہیں سنتیں، مجھ سے بے دھیان کیوں ہو گئی ہیں؟ میں نے بتایا ہے میرا دل نہیں لگتا۔ میں خاموش ہو گئی۔ مجھے احساس ہوا کہ یہ کوئی ایسی ویسی بات نہیں، اس بات کی کوئی بنیاد ہے۔ رات کے وقت جب سب سونے کو چلے گئے تو میں نے اس سے پوچھ گچھ کی۔ میں نے کہا بیٹی، مجھے صاف صاف بتاؤ، ظفر تمہیں ٹھیک تو رکھتا ہے؟ کہنے لگی ماں، مجھے ظفر سے کوئی شکایت نہیں، ظفر نہایت اچھا آدمی ہے۔ ان کی شادی کو آخر چند سال گزر چکے تھے، ہم سب جانتے ہیں کیا کچھ نہیں ہو جاتا۔ میں نے پوچھا، ظفر تم سے اسی طرح محبت کرتا ہے؟ کہنے لگی ظفر میرے اور بچوں کے اوپر جان دیتا ہے۔ میں نے کہا بیٹی، میں جان دینے کی بات نہیں کر رہی، میں پوچھ رہی ہوں کہ تمہارا شوہر تمہارے ساتھ اسی طرح پیار کرتا ہے جیسے پہلے کرتا تھا؟ کہنے لگی ہاں، پہلے سے زیادہ کرتا ہے۔ آپ مجھ سے یہ باتیں کیوں پوچھ رہی ہیں۔ ظفر سے مجھے کوئی شکایت نہیں۔ میں نے کہا خرچے سے تو تنگ نہیں رکھتا۔ کہنے لگی سارا خرچہ میرے ہاتھ میں ہوتا ہے، ظفر بے چارے کا اپنا کوئی خرچہ ہی نہیں۔ میں نے کہا بھئی میری تو عقل میں کچھ نہیں آتا۔ آخر تمہیں کس بات کی تکلیف ہے۔ کوثر میرا منہ دیکھنے لگی، جیسے اس کو یقین نہ آ رہا ہو۔ پھر کہنے لگی، ماں، میرا دل اچاٹ رہتا ہے بس۔ میں خاموش ہو رہی۔ اسی امید میں کہ خدا کرے اس کا دل ٹھہر جائے۔ شاہ جی کو علم ہے۔ انہوں نے دوا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی دی اور دعا بھی پڑھی۔ مگر کوثر کا دل نہ ٹھہرنا تھا نہ ٹھہرا۔ اسی طرح بھاگ بھاگ کر آتی رہی۔ میرے سامنے اس نے کبھی آنسو نہیں بہائے، مگر مجھے پتا تھا چھپ چھپ کر روتی ہے۔ دو چار بار ظفر آکر اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ میری بھاوج بولیں، خون میں بے قاعدگی آجائے تو ایسی حالت ہوتی ہے، دل اُڑنے لگتا ہے، اس کا علاج کراؤ۔ کسی نے کچھ کہا، کسی نے کچھ۔ میں پوچھ پوچھ کر تھک رہی۔ نہ خون میں بے قاعدگی، نہ دودھ کی کمی۔ مگر ایک ہی رٹ رہی، کہ میرا دل کسی بات پہ نہیں لگتا، مجھ سے کیوں پوچھتی ہیں، مجھے پتا ہو تو بتاؤں۔ ایک روز میں نے کہا بیٹی، خاوندوں کی کوئی بات نہیں ہوتی، خدا نے عورت کو بھی حق دے رکھا ہے۔ مگر میں تمہاری ماں ہوں، مجھ سے مت کچھ چھپانا۔ بتاؤ، کیا تمہارا جی کسی کے اوپر آگیا ہے؟ کوثر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے مجھے دیکھتی رہی، جیسے اس کو یقین نہ آرہا ہو۔ پھر بولی، نہیں اماں، یہ بات نہیں، ایسی بات پھر کبھی مجھ سے مت کرنا۔ ظفر کے خلاف میں کچھ سننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ اس روز میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ شوہر کے خلاف کوئی شکایت سننے کو تیار نہیں، اندر باہر کی خیر ہے، اللہ کا دیا سب کچھ موجود ہے، تو پھر قصہ کیا ہے۔ کہنے لگی اماں، اللہ کا دیا سب کچھ موجود ہے۔ مگر اس کے آگے کیا ہے؟ میں نے کہا اس سے آگے کیا ہوگا۔ کہنے لگی، اس کا مجھے پتا نہیں۔ میں نے کہا بیٹی، نماز پڑھا کرو۔ بولی باقاعدگی سے پڑھتی ہوں۔ وظیفہ بھی جو آپ نے بتایا تھا کرتی ہوں۔ دل پھر بھی نہیں ٹھہرتا۔ مجھے پتا نہیں کیا ہو گیا ہے.....،،

دو ننھے ننھے نازک ہڈیوں والے بوڑھے ہاتھ اب اس کی گود میں کھلے ہوئے رکھے تھے۔ وہ ایک سپاٹ، بے زیر و بم آواز میں بولے جا رہی تھی۔ مگر اس کے چہرے پہ رنگ جھلکنے لگا تھا۔ اس کی آواز سنتے ہوئے بعض دفعہ مجھے محسوس ہونے لگتا کہ کوثر مری نہیں بلکہ زندہ ہے، اور یہ اس کی اپنی آواز ہے جو اس عورت کے بدن میں داخل ہو گئی ہے۔ جب کبھی وہ سانس لینے کے لیے رکتی تو میں واپس اس کمرے میں پہنچ جاتا۔ سورج کے آگے بادل اکٹھے ہو رہے تھے اور کمرے میں روشنی کم ہوتی جا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہی تھی۔ اس نے دوبارہ بات شروع کی ،

"شاہ جی آپ کو یاد ہے، آپ نے وظیفے بتائے تھے۔ جب وہ یہاں ہوتی تو میں اسے اپنے کمرے میں بٹھا کر وظیفے کرواتی۔ مگر اس کی بھوک ختم ہو چکی تھی۔ آہستہ آہستہ اس نے وظیفے ترک کر دیے۔ نماز بھی میرے سامنے ہو کر پڑھ لیتی، ورنہ ضایع کر دیتی۔ اس کا بدن گھلتا جا رہا تھا۔ چھ ماہ کی بچی کو دودھ چھڑا دیا۔ کہتی تھی مجھے کوئی ہاتھ نہ لگائے۔ کسی نے کہا اس کو سودا ہو گیا ہے۔ مگر مجھ کو بھلا سودائیوں کی خبر نہیں۔ دلی میں ہمارے چوک کے اندر سودائیوں کا ایک پورا خاندان تھا۔ سر پیر کی انھیں خبر نہیں ہوتی تھی۔ میری بیٹی کے سر میں کوئی سودا نہیں تھا۔ وہ تو پوچھتی پھرتی تھی، مجھے بتاؤ، ارے کوئی مجھ کو بتاؤ۔ ظفر کو دیکھ کر اس کے چہرے پہ شرمساری کی کیفیت آجاتی تھی اور وہ چپکے سے اس کے ساتھ چل پڑتی تھی۔ میرا دل کٹنے لگتا تھا، میری بیٹی نے کیا قصور کیا ہے، نہ بے وفائی کی ہے نہ دغا بازی نہ لوٹ کھسوٹ، پھر شرمسار کیوں ہوتی ہے۔ ظفر عقل کا اندھا تھا، کچھ صبر کرتا، شبہے کی آگ میں نہ جلتا، کوئی صورت نکل آتی۔ کوثر اپنا رستہ چھوڑ دیتی۔ ظفر کو سب رستے آتے تھے، اس رستے کا اندھا تھا۔ مرد تھا۔

"ایک روز کوثر آئی تو مجھ سے کہنے لگی، ماں اب میں واپس نہیں جاؤں گی۔ میں نے کہا بیٹی توبہ کر، کیا تیرا دماغ چل گیا ہے۔ کہنے لگی ماں، تو مجھے اپنے گھر سے نکال دے گی؟ میں نے کہا بیٹی، تو جانتی ہے، پہلے میرا مردہ اس گھر سے نکلے گا تو پھر کوئی تجھ کو یہاں سے باہر کرے گا۔ مگر میری بیٹی، عورت کی جگہ اپنے شوہر کے گھر پہ ہوتی ہے۔ کہنے لگی اماں، یہ کوئی آپ کے شوہر کا گھر ہے۔ میں نے کہا یہ تو قسمت کے چکر ہیں جو ہمیں یہاں لے آئے ہیں۔ کہنے لگی نہیں، یہ قسمت کا چکر نہیں، یہ ہماری زندگی ہے کوئی جگہ مقرر شدہ نہیں ہوتی۔ اس کی باتیں سن کر میرا دماغ چکرا جاتا تھا۔ میری بیٹی کے سر میں کوئی سودا نہیں تھا۔ اس کے سر میں تو ایسے ایسے سوال تھے جو کبھی سننے میں نہیں آتے تھے۔ میں نے کہا بیٹی، مجھے آج تک پتا نہیں چلا کہ تمہیں کس بات کی تکلیف ہے۔ بولی اسی بات کی تو مجھے خبر نہیں۔ وہ آخری دن تھا۔ اس روز وہ باہر نکل گئی اور دیر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تک گھر واپس نہ آئی۔ شام کے وقت ظفر آ پہنچا۔ رات پڑ رہی تھی مگر کوثر کی کوئی خبر نہیں تھی اس کے ماموں، ماموں زاد بھائی، نوکر چاکر، مزارعے سب اس کی تلاش میں پھر رہے تھے ظفر مجھ سے سوال کرنے لگا، کہاں گئی ہے، کب گئی ہے، کیوں گئی ہے۔ میں نے بہانہ دانہ چھوڑ کر صاف کہہ دیا کہ مجھے کوئی خبر نہیں۔ میں نے کہا بیٹا، میری بات سنو، کوثر نے میرے بطن سے جنم لیا ہے مگر میری عقل سے باہر ہو گئی ہے۔ تم مجھے بتاؤ اسے کس بات کی تکلیف ہے۔ بولا یہی تو میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ عشاء سے تھوڑی دیر پہلے کوثر گھر میں آ وارد ہوئی۔ ظفر کو دیکھ کے اسی طرح شرم ماری سے آنکھیں نیچی کر لیں۔ مجھے پتا تھا اب صبح کو اس کے ساتھ واپس چلی جائے گی۔ میں نے کہا بی بی یہ کیا تم ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو، نہ آگے کی خبر نہ پیچھے کی۔ کہاں گئی تھیں؟ بولی لاہور چلی گئی تھی۔ میں نے پوچھا اپنے گھر گئی تھیں، کہنے لگی نہیں۔ تو پھر کیا کرتی رہی، میں نے پوچھا بولی کہ ایسے ہی بس، گھومتی رہی۔ میں نے کہا کہاں گھومتی رہی؟ کہا باغ میں پھرتی رہی۔ مجھے دکھائی دے رہا تھا کہ اس کا دل ٹھکانے پر نہیں تھا۔ مجھے اسی وقت سے احساس ہونے لگا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ مجھے کیا پتا تھا کہ وہ آخری دن تھا جب میں اپنی بیٹی کی آواز سنوں گی اور اس کا جیتا جاگتا ہوا چہرہ دیکھوں گی۔ میرے دل کے اندر وہ مری نہیں، نہ کبھی مرے گی۔ میری آنکھوں کے سامنے اس کی پھٹی پھٹی نظریں موجود رہتی ہیں، اور کانوں میں اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس وقت ہم میں سے کسی نے بات نہ کی۔ مگر رات کو جب بچے سو چکے تو کوثر آ کر میرے پاس بستر پہ بیٹھ گئی۔ ظفر اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ ظفر سامنے اس کرسی پہ بیٹھا تھا جہاں تم بیٹھے ہو۔ ظفر کے تیور دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ آج یہ شخص اپنے صبر کو ہاتھوں میں تھامے ہوئے ہے۔ کہنے لگا امی جان، اس سے پوچھیے اس کے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ میں نے کہا کوثر بیٹی بتاؤ۔ یہ تمہارا فرض ہے۔ تمہارا شوہر تم سے پوچھ رہا ہے۔ تمہارے پاس کس چیز کی کمی ہے؟ وہ سر جھکائے بیٹھی رہی، آہستہ سے بولی، کسی چیز کی کمی نہیں۔ ظفر اس سے پوچھنے لگا، تمہیں کیا چاہیے، مجھے بتاؤ۔ تمہیں کیا چیز چاہیے۔ میں نے کہا بیٹی جواب دو۔ تمہارے پاس کیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں ہے۔ عزت ہے، دولت ہے، تعلیم ہے۔ ٹھیک ہے دنیا میں بے قاعدہ کام بھی ہوتے رہتے ہیں۔ مگر کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ کسی کا خاوند خراب نکل آتا ہے، مارتا پیٹتا ہے، شرابی ہے۔ کسی کے بچے نہیں ہوتے۔ کوئی غریب ہوتا ہے۔ کوئی بیمار ہو جاتا ہے۔ کوئی مصیبت کا مارا مقدمے میں پھنس جاتا ہے۔ کوئی گناہ گار ہوتا ہے، کسی کا دل یہاں سے اٹھ کے وہاں جا لگتا ہے۔ جب کوئی ایسی بات نکلتی ہے تو پیچھے کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔ بتاؤ، تمہارے دو پیارے بچے ہیں۔ تمہارا شوہر تم سے محبت کرتا ہے، رتبے والا ہے، تمہارے پاس رہتا ہے، چھوڑ کر ادھر ادھر نہیں بھاگتا، تمہارے اوپر جان دیتا ہے، کسی چیز کی کمی نہیں آنے دیتا۔ اور تم کیا چاہتی ہو۔ کوثر نے ایک نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور بولی، ماں، مجھے پتا نہیں۔ میں کیا بتاؤں۔ ظفر کے دل میں بے اعتباری تھی۔ کہنے لگا، نہیں کیسے پتا نہیں۔ کون سی چیز میں نے مہیا کر کے نہیں دی۔ دنیا میں میرا ایک مقام ہے۔ تمہارے پاس گھر ہے، نوکر چاکر ہیں، پیسہ ہے، میری اپنی جائیداد ہے، نیک نامی ہے۔ اور تمہیں کیا چاہیے۔ کوثر سر جھکائے بولی، کچھ نہیں۔ ظفر نے کہا، میری طرف دیکھو، میں تم سے بات کر رہا ہوں، تم کبھی مجھ سے سیدھی بات نہیں کرتیں، ایک سال ہو گیا ہے، یہی کہے جاتی ہو کچھ نہیں، کچھ نہیں، ٹھیک ہے ٹھیک ہے، پتا نہیں پتا نہیں۔ کوثر نے سر اٹھا کر اسے دیکھا وہ ایسے دیکھ رہی تھی جیسے اس کو کچھ دکھائی نہ دے رہا ہو۔ ظفر نے کہا، میں تمہارا شوہر ہوں، میں نے ہمیشہ تمہیں خوش رکھا ہے، پہلے چار سال تم میرے ساتھ خوش تھیں، اب کیا ہو گیا ہے۔ اب کیا میں بدل گیا ہوں؟ بتاؤ۔ میں وہی آدمی ہوں؟ بولو۔ کوثر نے کہا ہاں۔ تمہارا شوہر ہوں؟ کوثر نے جواب دیا، ہاں۔ ہاتھ پاؤں کا تندرست ہوں؟ کوثر نے کہا، ہاں۔ شکل صورت کا تو بُرا نہیں ہو گیا؟ کوثر نے کہا نہیں۔ بچوں سے پیار کرتا ہوں؟ تمہاری خوشی کا خیال رکھتا ہوں؟ محنت سے کام کرتا ہوں؟ دنیا میں میری عزت ہے؟ کوثر نے کہا، ہاں۔ سیدھا کام پہ جاتا ہوں اور سیدھا گھر آتا ہوں یا نہیں، ظفر نے پوچھا، بتاؤ، گھر کے علاوہ کہیں اور جاتا ہوں؟ کوثر نے جواب دیا نہیں۔ صبح ناشتہ کرتا ہوں، دفتر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چلا جاتا ہوں، دفتر سے گھر آتا ہوں، اخبار پڑھتا ہوں، دفتر کا کام کرتا ہوں، کھانا کھاتا ہوں، سو جاتا ہوں۔ روزانہ میری روٹین یہ ہے یا کچھ اور ہے؟ کوثر بولی یہی ہے۔ ظفر بولتا گیا۔ کلب نہیں جاتا، تاش نہیں کھیلتا، کوئی یار باش نہیں۔ گھر پہ رہتا ہوں۔ سارا خرچہ تمہیں دیتا ہوں ٹھیک ہے یا غلط؟ بولو۔ کوثر بولی ٹھیک ہے۔ تو پھر تمہیں کس بات کی کمی ہے، کیا تکلیف ہے، کس چیز کی ہوس ہے، مجھے بتاؤ، میں تمہیں مہیا کر کے دوں گا۔ تمہیں زیور چاہیے؟ کوثر نے سر ہلا کر کہا نہیں۔ کپڑوں کی ضرورت ہے؟ کوثر نے سر ہلا کر کہا نہیں۔ فرنیچر چاہیے؟ کوثر کی زبان رک گئی مگر وہ سر ہلا کر کہتی رہی نہیں، نہیں، اور اسی طرح بیٹھی ظفر کو دیکھتی رہی، جیسے اس کی نظر بند ہو گئی ہو۔ میں نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور بولی، بیٹی کچھ منہ سے بولو۔ کوثر نے سر پھیر کر مجھے دیکھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی نظریں مختلف ہو گئیں، جیسے اس کی بینائی ایک دم لوٹ آئی ہو۔ اس کا چہرہ چمکنے لگا۔ میرے دل میں امید پیدا ہوئی۔ میں نے ہاتھ اٹھایا کہ اس کے سر پہ پھیروں۔ مگر اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کانوں پہ رکھ لیے، جیسے بے انتہا شور سے اس کا دماغ پھٹا جا رہا ہو۔ پھر وہ اوندھے منہ میری گود میں گر پڑی۔ میں گھبرا گئی۔ کیا بات ہے بیٹی، میں نے پوچھا۔ بتاؤ کیا بات ہے۔ اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا تو اس کی نظریں پھٹی پھٹی تھیں۔ وہ مجھے دیکھتی رہی، دیکھتی رہی، پھر بولی، اماں ایک بات کا مجھے علم ہے، ان چیزوں کے علاوہ اور بھی کچھ ہے۔ میں نہیں جانتی کیا ہے۔ مگر میرا دل کہتا ہے —— وہ چیخ کر رو پڑی۔ پھوٹ پھوٹ کر روتی گئی اور کہتی گئی، میں خود نہیں جانتی، مگر میرا دل کہتا ہے کہ کچھ ہے۔ مجھے پتا نہیں چلتا میں کیا کروں —— وہ میرے گلے سے چمٹ گئی۔ مجھے کسی شے کی پروا نہ رہی۔ ان ہاتھوں سے میں نے اس کا جسم سنبھالا۔ کپڑوں کے اندر وہ ہڈیوں کی مٹھ ہو چکی تھی۔ میرے دل میں یقین تھا کہ کوئی کچھ بھی سمجھے، میری بیٹی سچی ہے، جھوٹی نہیں۔"

اس کی آواز رکی تو کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ اس نے اپنا ستا ہوا چہرہ اٹھا کر پہلے حکیم کو، پھر مجھے دیکھا۔ "اب میں کسی کو کیا بتاؤں؟" وہ بولی۔ "کون اسے سچا سمجھے گا؟ ظفر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میری بیٹی کی طرف اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے اس کو اپنی آنکھوں اور اپنے کانوں پر اعتبار نہ ہو۔ صبح سویرے وہ اس کے ساتھ چلی گئی، ہمیشہ کی طرح خاموشی سے سر جھکا کر نکل گئی۔ وہ آخری دن تھا جب میں نے اس کی آواز سنی۔ اس کا چمکتا ہوا چہرہ دیکھا۔ ظفر مرد تھا۔ اس کا قاتل بنا۔ پھانسی پائے گا۔ مگر میری بیٹی مری نہیں، میرے دل میں وہ زندہ ہے۔ اب میں کسی کو کیا بتاؤں۔ میرے بیان کی کیا وقعت ہے؟" وہ میری طرف جواب طلب نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر اچانک وہ تکیہ چھوڑ کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے دونوں ہاتھ ہوا میں اٹھائے اور بولی، "میرا ایک بیان ہے۔ کوئی سننا چاہے تو سن لے۔" اس کی آنکھیں سکڑ گئیں اور اس کے چہرے پر رنگ جھلکنے لگا۔ جب اس نے منہ کھولا تو اس کے اندر سے ایسی چنگھاڑتی ہوئی آواز نکلی کہ میں چونک کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "کوئی سننا چاہے تو سن لے،" وہ دھاڑی، "میری بیٹی کو چاہے قصوروار سمجھو مگر وہ بدکار نہیں تھی۔"

اس کی آواز ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ وہ ہڈیوں کی مشت بستر پہ ڈھے گئی۔ اس نے اپنے بدن کو گھسیٹ کر کروٹ بھری اور منہ پھیر کر لیٹ گئی۔

ڈائری کے یہ اوراق میں نے ایاز کے گھر پہ پہنچ کر لکھے۔ واپسی کے سفر کی کوئی بات مجھے یاد نہیں۔ حکیم نے شاید مجھ سے کوئی بات کرنے کی کوشش کی، مگر میں نے ہوں ہاں میں جواب دے دیا۔ میرا دماغ بھنبھنا رہا تھا۔ نسیم گھر میں تھی۔ اس سے مختصر سی بات ہوئی۔ پھر میں سیدھا اپنے کمرے کو چلا گیا۔ کمرے میں داخل ہو کر میں نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ دروازہ بند کر کے میں نے قلم اٹھایا اور ڈائری کھول کر بیٹھ گیا۔ مجھے کہیں پر رکنے، یاد کرنے یا سوچنے کی ضرورت نہ پڑی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوثر کی ماں کا ایک ایک لفظ میرے ذہن کی دیواروں پر کندہ ہو گیا ہے اور دمک رہا ہے۔ جب میں نے لکھنا بند کیا تو تھکن سے چور ہو چکا تھا۔ بستر پہ لیٹ کر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میری آنکھوں کے سامنے کوثر کی ماں کا چہرہ آ گیا۔ بڑھاپے کی سلوٹوں والا بے جان چہرہ اور دھیمی سپاٹ آواز: میری بیٹی سچی ہے، جھوٹی نہیں۔ اب میں کسی کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیا بتاؤں ؟ دفعتہً میں نے دیکھا کہ اس چہرے کا روپ بدل گیا ہے، سلوٹیں غائب ہو گئی ہیں۔ اب وہ ایک جوان عورت کا چمکتا ہوا چہرہ ہے جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا مگر اس کے باوجود جانا پہچانا ہے۔ وہ بچوں کی سی تیز، دہشت زدہ آواز میں کہہ رہی ہے، اماں، مجھے پتا نہیں کیا ہے، مگر ایک بات کا مجھے علم ہے ـــ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں، پھر بند کر لیں۔ وہ چہرہ وہیں پہ موجود تھا۔ جب میں نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو کوئی دروازے کو دھڑا دھڑ پیٹ رہا تھا۔ اس وقت مجھے پتا چلا کہ میں کئی گھنٹے تک سوتا رہا ہوں۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ ایاز کھڑا تھا۔ باہر شام پڑ چکی تھی۔ ہم نے آتش دان کے پاس بیٹھ کر چائے پی۔ میرا ذہن کافی حد تک ٹھہر چکا تھا۔

"تم تو ایسے دکھائی دے رہے ہو جیسے کئی دن کے سفر سے لوٹے ہو۔" ایاز ہنس کر بولا، "کوثر کی ماں سے ملاقات ہوئی ؟"

"ہاں"۔ میں نے کہا۔

"کچھ پتا چلا ؟"

میں اٹھ کر اپنے کمرے میں گیا اور ڈائری اٹھا کر لے آیا۔ "اسے پڑھ کے دیکھ لو۔" میں نے کہا۔

ایاز نے ڈائری میرے ہاتھ سے لے لی، مگر اسے کھول کر نہیں دیکھا۔ وہ نسیم سے باتوں میں مصروف تھا۔ ان کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ رات کھانے پہ کچھ لوگ مدعو ہیں۔ اس بارے میں دو ایک باتیں کرنے کے بعد ایاز اٹھا اور ڈائری لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد نسیم بھی اٹھ کر کھانے کے انتظام میں مشغول ہو گئی۔ میں وہیں بیٹھا اماں کے بچوں سے کھیلتا رہا۔ آگ بجھنے لگی تو میں نے چند خشک لکڑیاں اٹھا کر آتش دان میں ڈال دیں۔ چند منٹ تک دھواں دینے کے بعد وہ بھبھک کر جل اٹھیں۔ دن بھر آسمان پہ بادل اکٹھے ہوتے رہے تھے۔ اب باہر بارش شروع ہو چکی تھی۔ ایاز دیر تک اپنے کمرے میں بند بیٹھا رہا۔ گھر بھر میں ماحول اب کم و بیش ساکن تھا، جیسے مہمانوں کی آمد سے قبل اکثر ہوتا ہے۔ کھانے کے کمرے اور باورچی خانے سے نسیم کے چلنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھرنے اور کوئی کوئی بات کرنے کی آواز آرہی تھی۔ بچے خاموشی سے اس کے آس پاس کہیں اپنے آپ میں مشغول تھے۔ ایاز اپنے کمرے سے باہر نہیں آیا تھا۔ اس وقت آتشدان کے پاس اکیلے بیٹھے بیٹھے مجھے ایک عجیب بات کا خیال آیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب میں کبھی کوئی کہانی نہیں لکھوں گا۔ اس خیال نے مجھے پریشان کر دیا۔ پھر اس پریشانی کو دور کرنے کے لیے میں آنے والے مہمانوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں نے کبھی ایاز کے گھر پر ہونے والی دعوتوں کا شوق سے انتظار نہ کیا تھا۔ مگر اس بھاری دن سے گزرنے کے بعد مہمانوں کی آمد کا خیال بے حد خوش کن معلوم ہو رہا تھا۔ میں گویا بے صبری سے ان کا انتظار کرنے لگا۔ اس دن کے واقعات نے میرے خیالات کو خرد برد کر دیا تھا۔

کوئی ایک گھنٹے کے بعد ایاز اپنے کمرے سے باہر آیا۔ اس نے چپکے سے لاکر ڈائری میرے ہاتھ میں پکڑا دی اور خود آتش دان کے سامنے ٹانگیں پھیلا کر، ہاتھ بغلوں میں دے کر کھڑا ہو گیا۔ وہاں پر وہ دیر تک کھڑا آگ کے شعلوں میں دیکھتا رہا۔ نسیم ایک بار کمرے میں داخل ہوئی اور بولی:

"کپڑے تبدیل نہیں کرو گے؟"

"جا رہا ہوں۔" ایاز نے جواب دیا۔ مگر مجھ سے اس نے کوئی بات نہ کی، صرف ایک آدھ مرتبہ گہری نظروں سے مجھے دیکھا، جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو مگر کہہ نہ پا رہا ہو۔ پھر اچانک وہ پلٹ کر لباس تبدیل کرنے چلا گیا۔ میں اسے کمرے سے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کی چال میں، اس کے کندھوں کے خم میں، اس کے بدن کی ڈھال میں ایک ایسی کیفیت تھی جیسے کوئی بیش قیمت شئے ہاتھ سے نکل گئی ہو، یا جیسے کسی خیال کا زور بالآخر ٹوٹ گیا ہو۔ وہ سر جھکا کر چل رہا تھا۔

رات کا کھانا پُر لطف رہا۔ میں نے ایاز کے گھر پر اس سے کہیں بڑی بڑی محفلوں اور شاندار ضیافتوں میں شرکت کی ہے، مگر اس محفل کا رنگ میرے اندر اس طرح محفوظ ہے جیسے وقت نے اسے چھو کر نہ دیکھا ہو۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس شام کو میرا دماغ ایک نچڑے ہوئے شہد کے چھتے کی مانند تھا جس کے ہزاروں چھوٹے چھوٹے خانے منہ کھولے دنیا کے نئے رس کو اپنے آپ میں سمونے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ کھانے کی میز پر پانچ مہمان تھے۔ میں ان سب سے پہلے سے متعارف تھا۔ دو وکیل تھے، خلیق اور مبشر۔ خلیق ایاز کا ہم عمر اور اس کے ساتھ کا پڑھا ہوا تھا۔ مبشر ایک نوجوان بیرسٹر تھا۔ تیسرا مہمان فیاض تھا۔ فیاض ایک انگریزی اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ اس کا ایک مقدمہ کسی زمانے میں ایاز نے لڑا تھا، اور بعد میں فیاض نے ہی ایاز سے انگریزی میں مضمون لکھوا کر اپنے اخبار میں چھاپنے شروع کیے تھے۔ اس وقت ایاز ایک دوسرے اخبار میں کام کرتا تھا۔ آخری دو مہمان اظہر اور اس کی بیوی تھے جو گھر کے ہی افراد تھے۔ سب سے پہلے اظہر اور اس کی بیوی آئے تھے۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا، چند منٹ میرے پاس رکنے کے بعد وہ دونوں گھر کے اندر چلے گئے، جہاں اظہر کی بیوی کلثوم نسیم کے کمرے میں جا کر اس سے باتیں کرنے لگی، اور اظہر کچھ دیر تک باورچی خانے، کھانے کے کمرے اور پچھلے برآمدے میں منڈلاتے اور نوکروں اور بچوں کے ساتھ باتیں کرنے کے بعد خود بھی اسی کمرے میں جا پہنچا جہاں اس کی بہن اور بہنوئی کھانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد خلیق اور فیاض آ پہنچے۔ وہ دونوں اکٹھے آئے تھے۔ ہم تینوں آگ کے سامنے کھڑے ہاتھ سینکتے ہوئے ایک دوسرے کا حال چال پوچھ رہے تھے کہ اندر سے ایاز اور اظہر برآمد ہوئے۔ چند منٹ تک ہم سب وہاں کھڑے ملتے ملاتے رہے۔ پھر خلیق نے اظہر اور ایاز سے کوئی ایسی بات چھیڑ دی جس کا مختلف عدالتوں سے تعلق تھا اور جو غالباً دن بھر سے چھڑی ہوئی تھی۔ فیاض میری طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ مجھ سے میری ایک کہانی کے بارے میں پوچھنے لگا جو اس کی رائے میں سیاسی مطلب رکھتی تھی، اور پہلی بار ایک نیم گرم مقبول عام پرچے میں شائع ہوئی تھی۔ مجھے یہ جان کر ذرا سی حیرت ہوئی کہ اس قسم کا پرچہ اس کی نظر سے گزرا کرتا تھا۔ میں فیاض کے بارے میں کوئی اونچی رائے نہ رکھتا تھا، تاہم وہ ایک بڑے انگریزی اخبار کا مدیر تھا، اور میں کسی حد تک اس مقولے کا قائل ہوں کہ ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آدمی اگر کسی حیثیت کو پہنچ جائے تو اس کے اندر کم و بیش اس حیثیت کے برابر اہلیت پیدا ہو جاتی ہے۔ فیاض کی شکل و صورت خاصی مرعوب کن تھی۔ وہ کوئی پچاس کے لگ بھگ کا آدمی تھا، مگر اس کے سر پہ سفید لمبے لمبے گھنے بال تھے۔ وہ بھاری سیاہ فریم والا چشمہ لگاتا تھا اور ہمیشہ سفید کرتے پاجامے اور سفید سوتی واسکٹ میں ملبوس ہوتا تھا۔ سردی کے موسم میں وہ اوپر سفید شیروانی پہن لیا کرتا تھا۔ اس کا بات کرنے کا انداز نہایت نفیس، بھاری بھرکم اور باعلم تھا۔ اپنے تجربے کے اندر میں نے ایسی وضع قطع رکھنے والے جتنے لوگوں سے واقفیت حاصل کی ہے بعد میں ان کی استعداد کے بارے میں مجھے مایوسی ہی ہوئی ہے۔ چنانچہ فیاض اپنی حیثیت اور اپنے خلوص کے باوجود ہمیشہ مجھ کو مہر و پیار سا لگا کرتا تھا۔ ہم باتیں کرتے کرتے کرسیوں پہ بیٹھ چکے تھے۔ اس شام کو میری کیفیت کچھ ایسی تھی کہ میں کسی سے اپنی کہانیوں کے بارے میں بات کرنا نہ چاہتا تھا۔ فیاض نفیس مزاج کا آدمی تھا۔ میری جانب سے سرسری سا لہجہ دیکھ کر اس نے سوالات کرنے چھوڑ دیے اور مجھے اپنی رائے سے آگاہ کرنے لگا۔ ایاز کے گروپ کی گفتگو خاصی اونچی آوازوں میں جاری تھی۔ نسیم اور بچوں کی آوازیں دوسرے کمروں سے آ رہی تھیں۔ چند منٹ کے بعد فیاض اچانک کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو نسیم اور کلثوم کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔

"بھائی بیٹھے رہیے۔" نسیم نے سب سے مخاطب ہو کر دونوں ہاتھ ہوا میں لہرائے۔

"وعلیکم السلام۔ آپ تو آج کل نظر ہی نہیں آتے بھائی۔" وہ اظہر کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے دور سے فیاض کو مخاطب کر کے بولی، "کہاں غائب رہتے ہیں؟"

"غائب کہاں رہتا ہوں حضور۔" فیاض بولا، "اپنے دفتر میں بیٹھا مکھیاں مارا کرتا ہوں۔ اور آپ کے دعوت نامے کا انتظار کرتا رہتا ہوں۔"

"اچھا!" نسیم ہلکے سے طنز کے ساتھ بولی، "سنا تھا آپ آجکل بہت مصروف رہتے ہیں؟"

"جناب ہمیں کون پوچھتا ہے۔" فیاض بولا، اور بات کرتا ہوا جلدی سے بڑھ کر نسیم کے پاس کرسی پہ جا بیٹھا۔ میں اکیلا ایک طرف بیٹھا رہ گیا۔ کچھ دیر کے بعد میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا اور پردہ اٹھا کر شیشے سے باہر جھانکنے لگا۔ بارش زوروں پر ہو رہی تھی۔ میرے عقب پر کمرہ آوازوں سے گونج رہا تھا، مگر میرے دل میں ابھی تک ہُو کا عالم تھا۔ میں نے پردہ گرا دیا اور واپس چلا آیا۔

اب ہم ساتوں ایک نصف دائرے میں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ فیاض ابھی تک نسیم کو باتوں میں لگائے ہوئے تھا۔ میری دائیں جانب کلثوم بیٹھی تھی۔ ہم کئی سال سے گو ایک دوسرے کو جانتے تھے مگر اتفاق ایسا ہوا تھا کہ ہماری آپس کی رغبت کبھی بڑھ نہ سکی تھی۔ اس وقت وہ خاموش بیٹھی تھی۔ میں نے رسمی طور پر اس سے ایک آدھ بات کی۔ جب گفتگو میں ایک وقفہ آیا تو نسیم نے ایاز سے کہا:

"مبشر صاحب ابھی نہیں آئے۔"

"ہاں۔" ایاز گھڑی پر نظر ڈال کر بولا، "مبشر ابھی تک غائب ہے۔"

"مبشر بہت مصروف آدمی ہے بھائی۔" خلیق خاص اپنائیت کے انداز میں بولا۔ "میں نے ساتھ لے کر آنے کی پیشکش کی تھی مگر اس نے رد کر دی۔ اصل میں اسے لا کالج میں کسی یونین کے جلسے میں جانا تھا۔"

"پانچ دس منٹ اور انتظار کر لیتے ہیں۔" ایاز ہولے سے بولا۔ نسیم نے سر ہلا کر اس سے اتفاق کیا۔

"موسم خراب ہے۔" فیاض بولا، "شاید نہ ہی پہنچ سکے۔"

"وہ بڑا باضابطہ آدمی ہے یار۔" خلیق نے کہا، "ضرور آئے گا۔ ورنہ فون تو ہر حال میں کر دے گا۔"

کچھ دیر کے بعد فون کی گھنٹی بجی تو ایاز نے لپک کر فون اٹھایا۔ سب لوگ متوقع تھے کہ مبشر کا فون ہو گا۔ مگر ایاز نے آ کر بتایا کہ اظہر کے ایک اسسٹنٹ کا فون ہے، جس نے اگلی صبح کی ایک پیشی کے بارے میں ایک ضروری پیغام دیا ہے۔ ایاز اظہر کو پیغام سنانے لگا۔ اظہر نے کہا، "یار مجھے ہی فون دے دیا ہوتا۔" ایاز بولا، "چھوڑو یار، تم نے بھی ایک سے ایک چندا اکٹھا کر رکھا ہے۔ میں اسے اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ کارروائی ڈال رہا تھا۔ اور کوئی بات نہیں تھی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خلیق شرارت سے بولا: "دیکھو بھئی اظہر، میں نے تو پہلے ہی تم سے کہہ دیا ہے۔ اپنے بھائی کا خیال رکھو تیری پریکٹس کو سبوتاژ کرنے کے پیچھے پڑا ہے۔"

"خلیق بھائی۔" نسیم بولی، "اگر آپ ہمارے گھر میں فساد ڈالنے کی کوشش کریں گے تو پھر دیکھ لیجیے۔"

"آپ کو کھانا نہیں ملے گا۔" فیاض نے جلدی سے کہا۔ خلیق قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ ایاز نے دروازہ کھولا تو مبشر کھڑا تھا۔ اس کے بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ اس نے اپنا گیلا چشمہ اتار کر ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا اور پانی سے بھرے ہوئے جوتے پائیدان پر سرگرمی سے پٹک پٹک کر خشک کرنے میں مصروف تھا۔ اس کا چہرہ، جو معمولاً ہلکے سے تعجب کی کیفیت لیے رہتا تھا، اسوقت مزید حیرانی کا حامل تھا، گویا اس کی سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ اس کے ساتھ کیا حادثہ پیش آگیا ہے۔ سب لوگ اس کا حلیہ دیکھ کی ہمدردی سے ہنس پڑے۔ ایاز نے اس کی برساتی اتروا کر دروازے کے پیچھے ٹانگ دی اور اسے بازو سے پکڑ کر آتش دان کے سامنے لا کھڑا کیا۔

"گیٹ سے یہاں تک آنے میں یہ حالت ہو گئی ہے۔" مبشر حیرت زدہ آواز میں بولا۔

"کیسے پہنچے؟" ایاز نے پوچھا۔

"لڑکوں کے پاس ایک ٹوٹی ہوئی وین تھی۔ اس میں چھوڑ گئے ہیں۔"

"کالج میں آج کل کیا ہو رہا ہے؟" اظہر نے پوچھا۔

مبشر آگ کے سامنے جھک کر ہاتھ سینکتا ہوا انھیں کالج کی یونین کا کوئی قصہ بتانے لگا۔ اس نے رومال سے چشمے کے شیشے صاف کر کے اسے آنکھوں پہ لگا لیا تھا۔ مبشر کی تیز تیز سیاہ آنکھیں تھیں، اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے بارش میں بھیگنے کے حادثے کو فراموش کر کے اب مکمل طور پہ اس نئے واقعے میں محو ہو چکا تھا۔ نسیم نے اسے اندر سے ایک تولیہ لا کر دیا۔ مبشر نے باتیں کرتے کرتے تولیے سے رگڑ کر سر کے بال خشک کیے اور پھر کوٹ کی جیب سے چھوٹی سی کنگھی نکال کر شیشے میں دیکھے بغیر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بالوں کو آگے سے پیچھے کی جانب کنگھی سے سنوارنے لگا۔ اس کے سر کی ہڈی چوڑی اور خوش شکل تھی۔ میں نے اسے لاپروائی سے کنگھی کرتے ہوئے دیکھ کر سوچا کہ اس شخص کو گنجا ہونے کا خوف کبھی پریشان نہ کرے گا۔ اس کا مضبوط جسم سوٹ کے اندر پھنسا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ کالج کے زمانے میں وہ یونیورسٹی کا اتھلیٹ رہا تھا۔ مبشر ایسے نوجوانوں میں سے تھا جن کی کامیابی اور ہر دلعزیزی ان کی پیشانی پہ لکھی ہوتی ہے۔ کلثوم کا چہرہ بھی، جو عموماً بے تاثر رہتا تھا، اس وقت مبشر کی باتیں سنتے ہوئے خوشی اور اپنائیت سے چمک رہا تھا۔ مبشر کو تولیہ پکڑانے کے بعد نسیم کمرہ چھوڑ کر گھر کے اندر چلی گئی تھی۔ چند منٹ کے بعد وہ واپس کمرے میں آئی اور ادھر اُدھر نظر دوڑا کر بولی:

"بھئی کھانا لگ گیا ہے۔"

نسیم کا کہنا تھا کہ خوش ذائقہ کھانا خوش شکل ہونے کا اہل بھی ہوتا ہے۔ کھانے کی میز پہ ایک نظر ڈال کر میں اس کی بات کا نئے سرے سے قائل ہو گیا۔ پلاؤ کے اوپر بادامی رنگ کے باریک تلے ہوئے پیاز زعفران کی شکل بکھرے تھے۔ شامی کبابوں پر ابلے انڈوں کے کاٹے ہوئے دو رنگے ٹکڑے رکھے تھے۔ سلاد کی پلیٹوں پر کھیرے، ٹماٹر اور سنگترے کی چھیلی ہوئی قاشیں سجی تھیں۔ کھیر کے ڈونگوں میں سفید بادام اور عنابی میوہ سطح کے اوپر اس طرح دکھائی دے رہا تھا جیسے موتی جڑے ہوں۔ خلیق اور اظہر ہاتھ ملتے ہوئے کھانے کی اور اس سے زیادہ نسیم کی تعریف کر رہے تھے۔ فیاض نے میز کے اوپر جھک کر ایک لمبی سانس کھینچی، پھر سانس روکے روکے سیدھا ہو کر دونوں ہاتھ پھیلا دیے، آنکھیں میچ کر چہرہ آسمان کی جانب اٹھا دیا اور اس طرح کا اظہار کیا جیسے بہشت میں پہنچ گیا ہو۔ صرف مبشر میرے پاس کھڑا سنجیدگی اور تعجب سے کھانے کو دیکھ رہا تھا، گویا فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ بیٹھ کر اسے کھانا شروع کر دے یا کوئی دوسرا قدم اٹھائے۔

"بھائی بیٹھ جائیے۔" آخر نسیم نے کہا، "کھانا شروع کیجیے۔ بہت باتیں ہو چکیں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرسیاں آگے پیچھے کھینچی گئیں اور سب میز کے گرد بیٹھ گئے۔ کھانا برتا جانے لگا۔ "لیجیے۔" "آپ لیجیے۔" "بھئی لیجیے نا۔ شروع کیجیے۔" "بھائی تمھیں ضرورت نہیں تو ادھر دے دو۔ کیوں بھوکا مرواتے ہو۔" "یار میری قوتِ شامہ تو مجھے پاگل کر رہی ہے۔" "تو پھر کھانا دینے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کی قوتِ شامہ نے ہی ہمارا مقصد پورا کر دیا ہے۔" "ہا ہا ہا۔" "ہا ہا ہا۔" مختلف قسم کی باتوں کے شور کے درمیان کھانا شروع ہوا۔ چاولوں کی پلیٹوں سے گرم گرم خوشبودار بھاپ اٹھ رہی تھی۔ چند منٹ کے بعد باتیں کم ہو گئیں اور چمچوں اور پلیٹوں کا شور بڑھ گیا۔ صرف بیچ بیچ میں "واہ، وا"، "بھئی مزا آگیا" اور "سبحان اللہ" کی آوازیں آتی رہیں۔ مبشر میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کی پلیٹ بھری تھی اور وہ سرگرمی سے کھانے کے لقمے لے رہا تھا۔ اسے کھاتے ہوئے دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ اسے کھانے کی لذت سے کوئی سروکار نہیں تھا بلکہ وہ محض بھوک مٹانے کی خاطر کھایا کرتا تھا۔ فطری طور پر مبشر ایک شرمیلا آدمی تھا اور رسمی باتیں کرنے میں ہوشیار نہیں تھا۔ ہم خاموشی سے بیٹھے کھاتے رہے۔ کھانے کی آدھی پلیٹ ختم کر کے اچانک وہ مجھ سے بولا: "آپ نے نیا آرڈی ننس پڑھا ہے؟"

میں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو وہ مجھے بتانے لگا کہ یہ آرڈی ننس شہری آزادی کے لیے کس قدر دور رس نتائج کا حامل ہو سکتا ہے۔ کھانے کی پہلی کھیپ ختم اور دوسری شروع ہو چکی تھی۔ میز کے گرد گفتگو دوبارہ ابھرنے لگی تھی۔ میز کے دوسرے سرے پہ جہاں ایاز، خلیق اور فیاض بیٹھے تھے، ایاز کے مستقبل کے بارے میں خیال آرائی ہو رہی تھی۔ فیاض نے ایاز کو سرکاری عہدے کی پیش کش (جو حال ہی میں دوبارہ موصول ہوئی تھی) قبول کر لینے پہ اکسانا شروع کر دیا تھا۔ دوستوں کا یہ حلقہ گو بے تکلف اور قریبی تھا، پھر بھی یہ ایک ایسا موضوع تھا جس پہ دو ٹوک بات کرنے سے احتراز کیا جاتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ماحول کی خوش دلی اور کھانے کی عمدگی فیاض کے جذبات پہ غالب آگئی تھی اور اس نے اپنے خیالات کا کھلا اظہار شروع کر دیا تھا۔ میرے کان میں اس بات کی آواز پڑی تو میں نے دل میں کھٹکا محسوس کیا۔ مبشر اپنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پلیٹ پر جھکا دو انگلیوں سے چاول کے دانے چن چن کر منہ میں ڈال رہا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہو رہا تھا۔ دفعتہً اس نے چاول چننا چھوڑ کر چمچہ اٹھا لیا۔ پھر چمچے کو کھانے کے لیے استعمال کرنے کی بجائے ہوا میں لہرا کر بولا:

"کیوں ؟"

اس کے سوال کو سب نے سنا، مگر فیاض کو، جو اپنی بات کے جوش میں تھا، اس کی جانب متوجہ ہونے میں چند سیکنڈ لگے۔ میز پر اب مکمل خاموشی چھا گئی تھی۔

"کیوں ؟" مبشر نے دہرا کر پوچھا۔

"میں سمجھا نہیں۔" فیاض نے کہا۔

"آپ ایاز صاحب کو کس بنا پر گورنمنٹ میں جانے کی تلقین کر رہے ہیں۔"

"تلقین نہیں کر رہا۔" فیاض نے جواب دیا، "اپنی رائے کا اظہار کر رہا ہوں۔"

"یہی میں پوچھ رہا ہوں۔" مبشر نے کہا، "آپ کی رائے کی بنیاد کس بات پر ہے۔"

فیاض کے چہرے کی کیفیت اب بدل چکی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور ایک لحظہ سوچنے کے بعد جواب دیا: "میرے خیال میں ایاز جیسے قابل لوگوں کو حکومت کا اختیار سنبھال کر ملک کا کاروبار چلانا چاہیے۔"

"تو آپ کے خیال میں جو لوگ حکومت میں شامل نہیں ہیں وہ ملک کا کاروبار نہیں چلا رہے ؟ وکیل۔ ڈاکٹر۔ سکول ماسٹر۔ ریڑھی والے۔ کیا آپ کے خیال میں ان لوگوں کا ملک کے کاروبار میں کوئی حصہ نہیں ؟"

"برخوردار میرا یہ خیال ہرگز نہیں۔ تمہیں اچھی طرح علم ہے کہ میں کیا بات کر رہا ہوں۔" فیاض نے اپنے نفیس ترین لہجے میں جواب دیا، "حکومت کی پالیسی بنانے کا کام سب سے اہم کام ہوتا ہے۔ اور ہر اس شخص کو جو اس کام کی اہلیت رکھتا ہے آگے بڑھ کر اپنی ذمہ داری قبول کرنی چاہیے۔"

"اور اس حکومت کی پالیسی کیا ہے ؟" مبشر نے پوچھا، "آپ کو خبر ہے یہ حکومت کیا کر رہی ہے ؟"